eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

CC BY
OPEN ACCESS

مغرب اور مشرق میں تہذیبی مکالمہ: دُنیا اور ناول میں (لندن کی ایک رات، حاصل گھاٹ، العاصفہ)

Cultural Dialogue in West and East: In the World and the Novel (London ki aik Rat, Hasil Ghaat, Al-asfa)

عالیہ نکہت، پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
Alia Nikhat, Ph.D Scholar, Deptt. Of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan
ڈاکٹر قاضی عابد، پروفیسر شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
Dr. Qazi Abid, Ph.D Scholar, Deptt. Of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Abstract:

Soon after the 9/11 the world changed its shape and the literature and the studies of literature also adopted new ways to understand contemporary World. After the influenced, books of S.P. Huntington and Francis Focoyama the critics also evaluated the literature in this context. It was the new way of cultural studies or culture studies. In this article three Urdu novels have been studied and the result of this study is that many different cultures have a profound dialogue among each other. The cultures of colonizers and the colonized and the culture of apparently independent countries also influence and make meaning full dialogues.

Keywords: Novel, cultural studies, culture studies, S.P. Huntington, Francis Focoyama, 9/11 attack, criticism

کلیدی الفاظ: ناول، ثقافتی مطالعات، ہنٹنگٹن، فرانسس فوکویاما، حملہ ۹/۱۱، تنقید

مابعد سرد جنگ امریکی ریاستی دانش نے ثقافت کے لفظ کو ایک نیا مفہوم دینے اور اسے اپنے متعین مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ دیوارِ برلن کے گرنے کے عمل نے مختلف ثقافتوں کے تنوع کو سیاسی شناخت عطا کیے جانے کے عمل کو تیز تر کردیا ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں اقتصادی جدلیات کی حرکیات تو ویسی ہی تھیں جیسی اب ہیں لیکن اس جدلیات کے دو رنگ بہت واضح اور نشان زد تھے۔ افغانستان میں روس کی آمد نے امریکہ کو موقع مہیا کیا کہ اب اس اقتصادی جدلیات کے یمینی یساری نشانوں کو بدلنا شروع کرے اور اس پر تمدنی اور مبینہ ثقافتی روغن چڑھانا آغاز کرے۔ روس کی اپنے سرحدوں کی واپسی اور نظریاتی شکست کے بعد یہ عمل نسبتاً آسان ہوگیا۔ ۹/۱۱ کے واقعے نے اس سارے عمل کو تیز تر کردیا اور یمینی بسیاری پیکار ثقافتی جدل کا رنگ اختیا کرگئی۔ ثقافت کے اس نقاب کے پیچھے بھی مذہب کا چہرہ دیکھا جاسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ماؤزے تنگ کے چینی ثقافتی انقلاب نے ثقافتی بُعد سے فوکویاما اور ہنٹنگٹن جیسے ریاسی دانشوروں کو اپنے اپنے نظریات استوار کرنے اور اسے ایک ہتھیار کے طور پر امریکہ کے حوالے کرنے کا خیال سجھایا ہو۔ یہ بات واضح ہے کہ پچھلی صدی کے آخری دہے میں ثقافت کو یہ نیا مفہوم اورمطلب عالمی سیاست کے تناظر میں متشخص کیا گیا۔ اس سے قبل ثقافت اور اس کے علائم اپنے مثبت حوالوں کے ساتھ استعمال ہوتے تھے۔ ہر خطہ دوسرے خطے کے ثقافتی مظاہر کو دلچسپی اور احترم سے دیکھتا تھا۔ اب علمیات پر سیاست کی ایک خاص وضع کی حکمرانی کے نتیجے میں اسلامو فوبیا کا مظہر ظاہر ہوا اور مغرب کے لوگوں کے اندر مشرقی ثقافتوں کا خوف پیدا کیا گیا۔ اس مضمون میں ثقافت کو اس کے علمیاتی مفہوم میں دیکھا جائے گا نہ کہ اس تازہ طے شدہ معنی میں۔

> ”سرد جنگ کے بعد کے برسوں میں لوگوں کی شناخت اور اس کی شناخت کی علامات میں ڈرامائی تبدیلیاں آئیں۔ عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر از سر نو استوار ہونے لگی۔ اُلٹے جھنڈے عبوری دور کی علامت تھے لیکن زیادہ سے زیادہ پرچم صحیح انداز میں اور بلندی پر لہرائے جانے لگے اور روسی اور دیگر اقوام اپنی اپنی نئی ثقافتی شناخت

کی ان اور دیگر علامات سے تحریک پارہی ہیں اور ان کے پیچھے چل رہی ہیں۔"(۱)

"ما بعد سرد جنگ کی دنیا میں پرچموں کی اہمیت ہے اور اس طرح ثقافتی شناخت کی دوسری علامتیں بشمول صلیبیں، ہلال حتیٰ کہ اوڑھنیاں بھی اہم ہیں کیونکہ ثقافت کی اہمیت ہے اور بیشتر لوگوں کے لیے ثقافتی شناخت سب سے زیادہ با معنی شیہوتی ہے۔لوگ نئی لیکن اکثر پرانی شناخت دریافت کررہے ہیں اور نئے لیکن اکثر پرانے پرچموں کے سائے تلے مارچ کر رہے ہیں جو نئے لیکن اکثر پرانے دشمنوں سے جنگ کی طرف لے جاتے ہیں۔"(۲)

"جدیدیت سے تحریک پا کرعالمی سیاست ثقافتی خطوط پر تشکیل پا رہی ہے۔ ایک جیسی ثقافتوں والی اقوام اور ممالک قریب آرہے ہیں۔مختلف ثقافتوں والی اقوام اور ممالک دور ہٹ رہے ہیں۔ ثقافت او ر تہذیب سے طے ہونے والی وابستگیاں نظریات اور سُپر طاقتوں کے روابط کے حوالے سے متعین ہونے والی وابستگیوں کی جگہ لے رہی ہیں۔سیاسی سرحدیں نئے سرے سے کھینچی جارہی ہیں اور ثقافتی سرحدوں پر منطبق ہوتی جارہی ہیں یعنی نسلی،مذہبی اور تہذیبی سرحدوں پر ثقافتی برادریاں سرد جنگ کے بلاکوں کی جگہ لے رہی ہیں اور تہذیبوں کے درمیان پائے جانے والے رخنے عالمی سیاست میں تصادم کے مرکزی خطوط بنتے جا رہے ہیں۔"(۳)

ناول ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو اپنے متن میں دنیا کے ساتھ زیادہ قربت کی حامل ہوتی ہے۔خواہ ناول بالزاک کا ہو یا مارکیز کا، نہ یہ دنیا سے پیچھے ہٹتی ہے نہ دنیا اس سے دوری اپنے حقیقت پسندانہ رویوں سے لیکر جادوئی حقیقت نگاری رجحانات تک ناول دنیا سے دوری اختیار نہیں کرتا۔ناول کی ثقافت یا جس خطے کے بارے میں لکھا جاتا ہے وہاں کی مخصوص ثقافتی بو باس اس کے اندر ضروری ہوتی ہے۔یہ ثقافتی بو باس بنیادی طور پر تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی راہ کھولتی ہے۔یہاں یاد رہے کہ مکالمہ یک طرفہ

عمل نہیں ہوتا اور اس کے باطن میں تکثیریت کی کئی خفی اور جلی لہریں موجود ہوتی ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں تہذیبی مکالمے سے صرف اثر پذیری مراد لی جاتی ہے۔ اس اثر پذیری کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔

ذیل میں اردو کے تین ناولوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ متون دنیا کے ساتھ اپنے اپنے انداز میں مکالمے کی راہ کھولتے ہیں جو (مکالمہ) بہت متنوع اور تکثیر پسند ہے۔

.....

"لندن کی ایک رات"(۴) نوآبادیاتی دور میں تشکیل دیا گیا متن ہے، یہ شاید اردو فکشن کا ایسا پہلا نقش ہے جس میں پورا جیتا جاگتا انگلستان موجود ہے۔ یہ ناولا نو آباد کار تہذیب اور نوآبادی بننے والی ثقافت کے درمیان تضاد اور تخالف کا اولین بیانیہ ہے۔ ہندوستان پر اٹھارویں صدی میں ایک اور نئی نوآبادی(۵) میں ڈھلنا شروع ہوا، اس کی قدیم تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہاں ایک تکثیری تہذیب موجود تھی جو دراوڑوں، آریاؤں اور مسلمانوں کے مختلف ثقافتی مظاہر سے مل کر بنی تھی۔ اس موتیف کے اندر کئی رنگ تھے۔ دراوڑی نسبتاً دبے دبے، آریائی اور مسلم بہت واضح، مگر دراوڑی اثرات بہت گہرے تھے۔ نئی نوآبادیات جو انگریزوں نے قائم کی اس میں ان تین قدیم رنگوں کے برعکس ایک تیزی سے جدید ہوتی ہوئی دنیا کے برتر ثقافتی، علمی اور معاشی نقش موجود تھے۔ بظاہر تو نوآباد کار سفید آدمی کے بوجھ کا نعرہ لگاتے ہوئے دعویٰ کرتا تھا کہ وہ یہاں پر تہذیب کاری کا عمل شروع کررہا ہے لیکن اصل میں وہ تہذیب کاری اور اپنی مرضی کی تہذیب کار کے برعکس خود اپنے اندروں غیر مہذب ہوتا جارہا تھا۔ اس نے جس جبر کو یہاں رواج دیا اور جس طرح سے یہاں کی دولت کو اپنی تجدید کاری کے لیے استعمال کیا اس کی مثال اس سے پہلے کے زمانے میں نہیں ملتی۔

یہ ناول یہاں کے مقامی باشندے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی استحصال اور اس کی طرف سے تیزی سے بڑھتے ہوئے ردعمل اور اضطراب کی کتھا ہے۔ یہ اُداس نسلوں کی نہیں مضطرب نسلوں کی کہانی ہے۔ اسی مضطرب نسل کے کچھ لوگ تعلیم کی غرض سے انگلستان مقیم ہیں جہاں انھیں غلام ہندوستان اور آزاد انگلستان کا فرق نئے خواب

دکھاتا ہے۔ نئی تعلیم جس شعور کو پیدا کرتی ہے۔وہ متنوع سوالات ان کرداروں کے اندر جنم کا وسیلہ بنتا ہے:۔

۱۔ آزادی اور غلام یا محدود آزاد ی اور مکمل آزادی میں کیا فرق ہے؟

۲۔ کالے(سانولے) اور سفید آدمی میں کیا فرق ہے؟ کیا یہ فرق ختم ہوسکتا ہے؟ یہ فرق انسان کا زائیدہ ہے یا اس کے کوئی الوہی سرچشمے ہیں؟

۳۔ انگلستان میں لبرل نارمز کیا ہیں؟ وہاں آکر یہ ہر باشندے کے لیے برابر ہیں تو غلام ہندوستان میں صرف غلامی کی ہی وجہ سے لبرل روایات مقامی باشند ے کا مقدور نہیں ہیں۔

۴۔ مقامی تہذیب میں ذات پات کا نظام کیا ہے اور کیوں ہے؟

۵۔ برصغیر کی سیاسی روایات اورانگلستان کی سیاسی روایات کیوں مختلف ہیں۔ ان قطبین کا فرق رکھنے والے سیاسی نظاموں میں سیاسی جماعتوں میں کیا فرق ہے۔ کانگریس، مسلم لیگ، ہندومہاسبھا اور دیگر سیاسی جماعتیں برطانوی سیاسی جماعتوں سے کس قدر مختلف ہیں اور کیوں؟

۶۔ مجموعی سیاسی صورتحال کیا ہے؟ مفاہمتی سیاسی رویہ مزاحمتی اور باغیانہ روش کب اور کیسے اختیار کرے گا۔

یہ اور ان جیسے کئی سوالات ایک ٹیوب سٹیشن سے نکل کر کسی پب او رکسی پب سے نکل کرکسی ہندوستانی کے گھر پر ہونے والی پارٹی میں شریک ہونے والے مضطرب کرداروں کے ذہنوں میں ان رویوں سے پیدا ہورہے ہیں جو انگلستان کے معروض میں جنم لیتی ہیں اور برصغیر کی غلام صورتحال ان سوالات میں درد کی شدت اور عمل کے لیے اضطراب فزوں تر کردیتی ہے۔ راؤ، اعظم اور نعیم تینوں کی سوچ میں ایک رو دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

> ”فٹبال کے میچ کے نتیجے۔”میچ کے آخری نتیجے“۔ اخبار بیچنے والے پکار رہے تھے۔ ٹہلتے میں اس کی نظر چنداور اشتہاروں پر پڑی جو تختوں پر چپکے ہوئے تھے“ بیکار مزدوروں کا ہائڈ پارک میں جلسہ “ دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار ہندوستانی نیٹوز کو فساد کرنے سے

روکا"۔ ایک گورا زخمی ہوا اور ۵ ا نیٹوز کی جان گئی۔"بڑے بڑے، کو ئی ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہار سرخ حرفوں میں لکھے ہوئے تھے۔اعظم کاخیال ایک لمحہ کے لیے اپنے دوست کے انتظارسے ہٹ کرہندوستان، وطن کی طرف گیا۔" یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔"نیٹوز " ہم"نیٹوز" ہیں۔ اور یہ لال منہے بندر،جو اس ملک میں رہتے ہیں، یہ کون ہیں؟۔"(۴)

"ٹام نے اپنا گلاس اٹھا کر دو گونٹ میں ساری بیئر ختم کر دی اور بآواز بولا" جم! میں تم سے کہتا ہوں میری بات سنو،میں لڑائی سے پہلے ہندوستان میں تھا اور میں نے وہاں کی حالت دیکھی ہے۔اس وقت میں جوان تھا۔میں احمق تھا،سنتے ہومجھے،میں احمق تھا،برٹش امپائر کا خیال کر کے میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑ نے لگتا تھا۔میں ہندستانیوں کو"کالا لوگ"،نگر" "نیٹوز" کہہ کر خطاب کرتا تھا۔میں ہندوستانیوں کو جانوروں سے بد تر سمجھتا تھا۔ہم لوگوں کو فوج میں یہی سکھایا جاتا تھا۔میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم ہندوستانیوں میں کس طرح صلح قائم رکھتے ہیں! میں تم سے کہتا ہوں جم کہ ہندوستان میں ہماری حکومت کی بنیاد خوف پر ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہندوستامیں ہماری وجہ سے امن قائم ہے۔ ممکن ہے۔ مگر امن کی قیمت کیا ہے؟میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ غریب، ننگے،بھوکے،جو کیڑے مکوڑے کی طرغ رہتے ہیں،لاکھوں کروڑوں انسان،مشکل سے تم یہ کہہ سکو گے کہ وہ انسان ہیں۔میں تم سے سچ کہتا ہوں ہمارے یہاں بیکار مزدوروں کی حالت اس سے ہزار درجہ بہتر ہے ہے۔اور اس پر بھی یہاں یہ شور و غل مچتا ہے،آئے دن جلسے ہوتے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں اور گورنمنٹ کو یہ جتلاتے ہیں کہ جب تک وہ بیکارمزدوروں کے اچھی طرح رہنے سہنے کا انتظام نہ کرے وہ مہذب گورنمنٹ کہلانے

کے لائق نہیں۔ جم میری بات کا یقیں مانو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ہندوستان میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر جگہ غربت ہی غربت دیکھی۔ ہم وہاں ڈیڑھ سو برس سے زیادہ سے ہیں اور صلح اور امن قائم کئے ہوئے ہیں۔ تم جب امن قائم رکھنے کی باتیں مجھ سے کرتے ہو تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔"(۵)

"ٹام اب بچے کی طرح خوشی سے مسکرانے لگا جیسے اُسے کوئی بڑی فتح ہوئی ہو۔ اس نے راؤ اور اعظم کی طرف نظر ڈالی اور مسکرا کر آنکھ ماری۔ گویا یہ کہنا چاہتا تھا"جم کو بُرا آدمی مت سمجھنا۔ دل اس کا بھی صاف ہے۔ ہندوستان کے حقوق کو وہ مانتا ہے، صرف ذراسی بات تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اب وہ ہمارے ساتھ ہے۔"(۶)

" ہلو بلیکی" اس نے اعظم اور راؤ کو پکارا کر کہا۔ اعظم اور راؤ یکبارگی اس کی طرف مڑے۔ ننگے سر ایک دبلا پتلا آدمی پھٹے حالوں لال ٹماٹر کا سا چہرہ بنچ پر بیٹھا ہوا بد مستی کی ہنسی ہنس رہا تھا۔ راؤ اور اعظم جن پر شراب کا اثر ہو رہا تھا۔ غصہ سے کانپ گئے۔ ذلت بے آبروئی، ہندوستانیوں کی قسمت میں ہی لکھی تھی۔ دنیا کے جس حصے میں وہ جائیں غلامی کا ٹیکہ ہر گز ان کے ماتھے سے نہیں چھوٹ سکتا۔ راؤ اور اعظم دونوں نے یہی محسوس کیا۔"(۷)

یہ ناول بنیادی طور پر تہذیبی مکالمے کی جس سطح کو ہمارے سامنے لاتا ہے وہ دو طرح کی ہے۔ ایک تو مقامی آدمی اور نوآبادکار کا تضاد، جو کئی سطحوں کا ہے۔ دوسرے وہ سیاسی، تہذیبی، علمی اور معاشی تضاد جو ہندوستان کو مزاحمت اور بغاوت پر اُکساتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے اولین کارآمد اضطراب انہیں پڑھی لکھی نسلوں میں پیدا ہوا تھا جو اس ناول کے کرداروں کے مماثل ہیں۔ گاندھی، نہر اور جناح اسی تعلیم یافتہ نسل کے لوگ تھے، جنہوں نے آزادی کی جنگ اپنے اپنے انداز میں لڑی۔ یہ وہ طویل سیاسی مکالمہ تھا جو اس ناول کے اندر سے نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

.....

"حاصل گھاٹ" ۲۰۰۳ء میں ۹/۱۱ کے بعد مشرق و مغرب کے تہذیبی تناظر میں وجود میں آیا، بانو قدسیہ کی ذہنی اور تخلیقی ساخت کو سمجھنے کے لیے راجہ گدھ اور "روس سے معذرت کے ساتھ" ایک سیاق و سباق کا کام دیتے ہیں۔ یہ ناول ویسے تو اعلیٰ فکشن کی بجائے مقبولِ عام ادب کے زمرے میں آتا ہے مگر شاید مقبول عام ادب کی حرکیات اس فکری دنیا کو سمجھنے میں زیادہ معاونت کرتی ہیں جو اس میں ملفوظ کی جاتی ہے۔ یہاں بھی ایک یک طرفہ مکالمہ اس نسل کی طرف سے نظر آتا ہے جو تارکین وطن کہلاتی ہے اور اپنے اپنے اسباب کی وجہ سے ترک وطن کی حامل ہوتی ہے اور جس ملک کو اپنا مسکن بناتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت اور نفرت کا دورخی /دوجذبی رشتہ استوار رکھتی ہے۔ ان کے ذہن کے اندر بھی ایک عجیب وضع کی پیچیدگی ہوتی ہے جو بسا اوقات ان کے افعال میں بھی ڈھل جاتی ہے۔ یہ ناول کیوں کہ ۹/۱۱ کے بعد لکھا گیا ہے اس لیے اس میں جذباتیت اور رقت ان کرداروں میں زیادہ نظر آتی ہے جو اس واقعے کے بارے میں حقائق کی بجائے اپنے ایک نقطۂ نظر کے حوالے سے بات کرتے ہیں، یہ مغرب کے ساتھ کسی تہذیبی مکالمے کو راہ دینے کی بجائے یک طرفہ طور پر مغرب کی جو تصویر ہمارے سامنے لاتا ہے، وہ مغرب سے اکراہ پیدا کرتی ہے اور مغرب کو ہی مشرق کے بہت سارے مسائل کا ذمے دار قرار دیتی ہے، یہ بات درست تو ہے کہ مغرب نے ان خطوں میں سرد جنگ کے دنوں سے لیکر ۹/۱۱ اور اس کے بعد تک اپنے اپنے مفادات کی نگہبانی میں بہت کھلواڑ کیا ہے اور مغرب کے روشن فکر دانشوروں نوام چومسکی، ہاورڈزن اور رابرٹ فسک نے اس حوالے سے کھل کر لکھا بھی ہے مگر جو رویہ اس ناول میں بیان کنندہ یا راوی نے اختیار کیا ہے، اس کے جو بیانات ہیں وہ کسی فکری اساس کے حامل نہیں بلکہ جذباتیت کی دنیا سے برآمد ہوئے ہیں۔

> "لیکن ۱۹۹۱ء میں جب روس کے اقتدار کے پرخچے اڑے اور دنیا میں ایک ہی سپر پاور رہ گئی۔۔۔ تو ایک اور آدرشی تحریک فیل ہوگئی۔۔۔۔ حالات کچھ اور کے اور ہوگئے۔ اب امریکہ اور بھی بہادر ہو گیا، بولڈ اور دہشت پسند ہوگیا۔ وہ اپنے نیو ورلڈ آڈر سے دنیا کے

ممالک کو دھمکانے ڈرانے اور پچکارنے میں کامیاب ہونے لگا۔۔۔ لیکن اسلام کی طاقت اندر ہی اندر امریکہ کو کہیں سہار ہی تھی۔۔۔۔ اگر تمام مسلمان حکومتیں کسی طور پر یکجا ہوجائیں، پھر یہ اتنی لمبی چوڑی Beltکو توڑنا یا سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہوتا۔ لکڑی کا یہ گٹھا توڑنا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا، لیکن امریکہ کے بہادر جیالوں نے ہر مسلمان مملکت کے لیے الگ پلان بنایا۔ ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو آپس میں لڑا کر دونوں طاقتوں کو کمزور کر دیا۔ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سالمیت کو دھچکا لگانے والا ہے۔"(۸)

"روس کی شکست کے بعد امریکہ نے مسلمان ملکوں میں اپنے اسلحہ کے مارکیٹ قائم کیے۔ وہ ترقی پذیر ملکوں کو اسلحہ بیچتا جو زیاد Sophisticatedنہ تھا۔ بہادر امریکہ کو علم تھا کہ جب کسی ملک میں اسلحہ ہوتا ہے تو وہ استعمال میں ضرور آتا ہے۔ پھر ہر مظلوم اسی اسلحہ کے ہاتھوں کبھی کبھی ظالم بھی بن جاتا ہے۔ دین دار گروہ تک اپنی حفاظت کے لئے اس اسلحہ کا سہارا لیتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنی اپنی مضبوطی اسی اسلحے سے قائم کرتی ہیں۔۔۔ کمزور کو ان ہی ہتھیاروں سے طاقت ملتی ہے۔"(۹)

" میں کب کہتا ہوں کہ میں Idealismکا شکار ہوں۔۔۔"" میں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں ساری چالیں۔۔۔ انگور کھٹے ہوں تو آدمی نیک بن جاتا ہے۔۔۔ تم جیسے لوگوں کو اگر دولت، سٹیٹس اور موقعہ ملے تو تم نہ جانے کیا کیا کردو۔۔۔ نمرون لچے بد معاش نکلو۔۔۔۔ تمہارا ہاتھ ہی نہیں پڑتا،اس لیے تم نیکی کی وردی پہن رکھی ہے۔۔۔ تم یہاں رہے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔۔۔ یہ جگہ میرے لیے گالی ہے۔۔۔۔ ان کمفرٹیبل ہے۔۔۔۔ میں قربانی تو دے سکتی ہوں لیکن ساری عمر قربانی کا بکرا نہیں بنی رہ سکتی۔۔۔۔انسان ایک بار پیدا ہوتا

ہے۔ ایک با ر زندگی گزار تا ہے۔" Life is for once only" منمنا کر جہانگیر نے جواب دیا۔"(۱۰)

" جمہوریت میں اکثریت من حیث القوم جو کچھ بھی کر تی ہے، اصول ٹھر تا ہے۔لباس اتاردے،برہنہ پن اصول۔ لباس پہن لے یہی پہناوا دل پسند۔۔۔ایک شادی رائج کردے مونو گیمی اصول۔۔۔بے شمار شادیوں کو رائض کر دے یہی میعار۔۔۔سب کی رائے سے حکومت چلائے درست۔۔۔اکثریت کسی کی نہ سنے اور آمریت کا ہی سونٹا کھڑکا ئے تو آمریت ہی من چاہا طریقہ۔اکثریت کے رسم و رواج، کلچر حکومت، سیاست یہ سب کو پسند آئے۔معیشت کی بانٹ میں منظق ہو یا نہ ہو اکثریت کا بہاؤ ضرور شامل ہوتا ہے۔اکثریت اپنے دیس میں لوہا منوالینے کی حثیت میں ہوتی ہے اور دھڑلے کی زندگی بسر کرتی ہے۔رائے عامہ کا بل ڈوزر سب کچھ ہموار کیے جاتا ہے۔(۱۱)

یہ ناول بنیادی طور پر اپنی اساس کہانی یا پلاٹ کی بجائے کرداروں کے لمبے چوڑے بیانات پر رکھتا ہے جس فکر کی ترسیل ناول نگار کرنا چاہتی ہیں۔ وہ اسی طرح ممکن تھی۔یہ مکالمہ بنیادی طور پر مشرق اور مغرب کے خطوں کے درمیان نہیں بلکہ ایک بڑے سے لاہور کے باسیوں کے درمیان ہے کہ مغرب سے کیسے حذر کرنا ہے۔انتظار حسین نے لکھا تھا کہ مکہ ہمارا خواب اور کربلا ہمارا مقدر ہے۔یہاں بھی اسی سے ملتی جلتی صورتحال موجود ہے۔ہمارا خواب ایسا امریکہ ہے جسے ہم کربلا میں ڈھال سکیں، اپنی سوچ اور مرضی کے مطابق ڈھالا ہوا امریکہ، اس طرح یک طرف تہذیبی مکالمت اس معاشرے کو ہی جامد کرتی ہے جہاں یہ مکالمہ جنم لیتا ہے۔ان خِطوں کا کچھ نہیں کرسکتی جن کے بارے میں یہ مکالمہ مقبولِ عام ادب میں جنم لیتا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کے لیے عرب خطہ بالعموم اور حجاز مقدس ہمیشہ سے قابلِ احترام اور قابلِ تقلید نمونے کا حامل رہا ہے۔یہ بات مسلمان بادشاہوں کی نہیں بلکہ عام عوام کی ہے جو سادہ لوحی کی حد تک اس خطے کو اپنے مذہبی اعتقادات اور عشق رسولؐ کی وجہ سے اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ حکومت نے اپنی سیاسی ساکھ کو بچانے کے لیے ریاست مدینہ کا نام بار بار استعمال کیا ہے۔ یہ ناول "العاصفہ" اس خطے کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتحال کو ہمارے

سامنے لاتا ہے۔ برصغیر کے عوام نے جب تحریکِ خلاف چلائی تو انہیں یہ علم نہیں تھا کہ اس سیاسی تحریک کا مقصد کیا ہے اور اس کے مضمرات کیا ہوں گے۔ انہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ یہ مسئلہ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں، ترکی اور خود عربوں کے بیچ ہے۔ یہ سادہ لوحی سیاست کے کاروبار میں مذہب کے استعمال کو فروغ دیتی ہے۔ العاصفہ بنیادی طور پر اس خطے کے لوگوں کی ذہنی رد تشکیل کا کام دیتا ہے۔ ہمارے خطے میں ۱۹۷۰ء کے بعد عرب / امریکی اثر و نفوذ بڑھا ہے۔ اقبال نے تو پچھلی صدی کے اوائل میں ہی عرب ثقافتی غلبے کی طرف اشارہ کر دی اتھا مگر فلسطین کے قضیے اور ۱۹۷۰ء میں پاکستانی مزدوروں کی عرب کی طرف تلاش رزق کا سفر بھی ان اثرات کو دو چند کرتا ہے۔ پھر سرد جنگ کے گرم ترین دنوں میں سرخ فوج کے خلاف امریکہ، عرب اور پاکستان مثلث نے ان اثرات کو انتہا پر پہنچا دیا۔ خدا اس سرزمین سے رخصت ہوا اور اللہ کی آمد ہوئی۔ یہ وسط ایشیائی مسلم ثقافت پر عرب مسلم ثقافت کے غلبے کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ العاصفہ اس عمل کی رد تشکیل پر مبنی مکالمہ ہے جو سرزمین عرب کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی صورتحال اور خود اس خطے کے امریکہ کے کارندے ہونے کی شہادت دیتے ہوئے اس ثقافتی غلبے کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ برصغیر کے جذباتی مسلمان اس ناول کے تناظر میں تکثیریت کی حامل ذہنی غلامی سے باہر آسکتے ہیں۔

اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں راوی یا بیان کنندہ کہیں دکھائی نہیں دیتا بلکہ اس کی بجائے کہانی، پلاٹ اور کرداروں کی وساطت سے اپنی بصیرت اور آگہی دھیرے دھیرے پھیلاتی جاتی ہے۔ پوری کہانی اپنے ثقافتی رویوں اور سیاسی صورتحال کے ساتھ موجود ہے۔ مذہب اساس سیاسی تہذیب کی تشکیل کے مدعیان کے لیے اس ناول میں بہت سامان عبرت موجود ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر اس خطے میں جو عرب آمریت متشکل ہوئی اسے اس خطے کے لوگ divine authority سمجھتے ہیں اور ہندوستان پاکستان میں بھی اس پر عمل کے خواہاں ہیں۔ یہ کہانی بتاتی ہے کہ کہ اس خطے میں جو حکمران الوہی اختیار کو اپنے لیے لازم قرار دینے کا ابہام پھیلاتے ہیں وہ تو خود مغرب کے حکمرانوں یا مغرب کی منشا کے تابع مہمل ہیں۔

یہ ناول اس نئی نوآبادیات کی کہانی جو بظاہر آزادی ہے لیکن فیصلہ کن قوتیں سفید محل میں بیٹھ کر عامل قوتوں کے ساتھ ان خطوں کی اقتداری خود کفالت کا کبھی بھرم رکھتے ہوئے اور کبھی کھولتے ہوئے ان کی ڈوریاں ہلاتی رہتی ہیں۔ اندھیرے اجالے کا یہ کھیل جس سٹیج پر کھیلا جارہا ہے اس کے ناظرین میں سے کچھ اس کھیل سے پوری طرح واقف ہیں اور اگر کچھ کھل کر بیان کرتے ہیں تو خشوگی کی طرح جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

"باہر کے ملکوں سے جو کتب اور رسائل اور اخبار آتے تھے پہلے تیل کی کمپنی ان کا سینسر کرتی تھی، کچھ رسالوں اخباروں میں لفظوں اور سطروں پر بے ڈھنگے پن سے ایسی سیاہی پھری ہوئی ہوتی تھی کہ مٹائے نہیں مٹتی تھی۔۔۔ جیسے تقدیر کا لکھا ہو۔بعض میں سے صفحے غائب ہوتے اور اکثر وہ شمارے اور کتابیں بھی سرے سے غائب کر دیئے جاتے تھے جو کمپنی کو پسند نہ ہوں اور انھیں قیمت ادا کر کے منگوانے والے سر پیٹتے رہ جاتے تھے۔ خود اوئل کمپنی جس ملک کی تھی وہاں کے عوام اپنے رسالوں،کتابوں کے اس حشر پر کبھی رضامند نہ ہوتے۔ایک بات اور:ایسی کتابیں یا رسالے باربار منگوانے والے کبھی کبھی سرزنش کے لیے مرکز الشرطہ میں بلائے جاتے تھے جہاں انھیں دھمکیاں سننی پڑتی تھیں۔ ان تیل کمپنی کے تاجروں کا لین دین ایسا تھا جو ہمارے یہاں کے ایک معمولی دکان دار کو بھی شرماتا۔ایک معمولی دکان دار بے ایمانی کرنے پر ایک نہ ایک دن پکڑے جانے کے خیال سے ڈرتا ہے۔یہ وولر بلیونئر،ترلیونئر تیل کمپنیاں زمین سے زیادہ سے زیادہ تیل نچوڑ کر کم سے کم دکھاتی ہیں اور سدا رونا روتی ہیں کہ تیل کے ذخیرے کم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا دھندا گھاٹے میں جا رہا ہے۔جب کہ تیل کم بولی لگانے والے اُن کے پسند کے ملک اور اس کی کمپنی کے ہاتھ بکتا ہے۔ سب جانتے ہیں سفید تاجر ملک کو لوٹ رہے ہیں لیکن ملک تک میں ہمت نہیں ہے کہ

انھیں ملک سے نکل جانے کو کہے۔ ایسا زور بس اپنے ملک والوں پر چلتا ہے یا اُن کام کرنے والوں پر جو گرے پڑے ملکوں سے یہاں آتے ہیں"۔(۱۲)

"لیکن جو میں کما رہا تھا اس میں اپنی ایک چھوٹی بُرنس بھی شامل تھی۔۔۔ در پردہ۔۔ ساری بوتلیں ابدائک کے دفتر تک نہیں پہنچی تھیں۔ چند ایک میں بازار میں بیچ لیتا تھا۔لیکن بیچے جانے سے پہلے وہ ابدائک کے دفتر میں چھی رہتی تھیں۔ وہاں نہ کبھی شر طے آتے تھے نہ وہاں سے کبھی کسی کو پکڑا گیا تھا۔یہی نہیں نہ میں نے کبھی کسی سفید آدمی کا ہاتھ کاٹے جاتے دیکھا ہے نہ سر۔رہے شراب بنانے والے امریکی اُنھیں کبھی کوڑے بھی نہیں پڑتے ہیں، ہاتھ کاٹے جانے کا تو کیا مذکور۔ بعض سفید عورتیں ان ملکوں میں امریکیوں اور جہان بھر کے دوسرے سفید مردوں کے درمیان گردش میں رہنے کے لیے لائی جاتی ہیں۔لیکن جس گناہ میں ملوث مرد اور عورت کو کوڑے پڑتے ہیں وہ اور ان کے ولی اس سے سدا بچے رہتے ہیں۔"(۱۳)

"بات صرف ایک اپنے صنف والے کو رتبہ دینے کی تھی لیکن تمام چھوٹے بڑے ملکوں میں آگ لگ گئی۔ ہمارے ملک نے اُسے بجھایا: نکاح مت پڑھواؤ اور چاہے جیسے اُسے اپنے سر آنکھوں پر بٹھاؤ۔ سوئٹزر لینڈ میں اس کے لیے وِلا خریدو اور ایلفا رومیولے دو، ایک نہیں دو تین۔۔۔ جہاں چاہے اُنھیں دوڑاتا پھرے۔۔۔ اس سے دوستی رکھو، تمہارا دل ہے، مگر شادی مت کرو۔شادی کے لیے ہماری بیٹیاں ہیں۔"(۱۴)

"یہاں کے ترائل مضحکہ خیز بھی ہوتے ہیں اور وحشیانہ بھی۔ سر نہ کاٹنے یا شوت نہ کرنے میں ایک فائدہ ہے: اگر دنجن میں اتارنے کے دو چار، دس دن بعد یہ ثابت ہوجائے کہ مجرم نے حیقت میں بغاوت نہیں کی تھی۔۔۔ اور یہ سزادی صرف باغیوں کو جاتی ہے۔۔۔ تو اس کے لیے نیچے رسی لٹکائی جاسکتی ہے کہ اوپر کھلی ہوا اور روشنی میں چڑھ آؤ۔

اگر رسی بے بوجھ اوپر آجائے تو اس میں سزا دینے والے پر عقوبت نہیں لگتی ہے۔ اُس نے تو بچانے کی کوشش کی تھی، زندانی قدرت موت مر گیا۔ سزا دینے والے کا ضمیر آئینہ ساں صاف رہتا ہے۔"(۱۵)

یہ ناول ہماری زمین کے قاری کو ان خطوں کے بارے میں جنہیں ہم تقدس مآب سمجھتے ہیں، درست سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتحال ہمارے سامنے لاتا ہے۔ دور کی روشنی کچھ اور نظر دکھاتی ہے مگر جب ہم اس متن کی روشنی میں اس دنیا کو دیکھتے ہیں تو پوری صورتحال واضح ہو جاتی ہے۔

.....

اوپر کی سطور میں جن تین ناولوں کا اس تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے وہ تینوں ناول اپنی دھرتی واسیوں کے ساتھ ایک تکثیری مکالمہ کرتے ہیں جو روایتی ثقافتی مکالمے سے اوپر کی سطح ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ہنٹنگٹن، سیموئل پی، ''تہذیبوں کا تصادم''، مترجم از سہیل انجم، کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص:۱۹

۲۔ ایضاً، ص۲۰

۲۔ ایضاً، ص۱۵۳

۴۔ سجاد ظہیر، ''لندن کی ایک رات''، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۷۴ء، ص۱۰

۵۔ ایضاً، ص۲۴

۶۔ ایضاً، ص۲۶

۷۔ ایضاً، ص۲۷

۸۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص۱۴

۹۔ ایضاً، ص۱۵

۱۰۔ ایضاً، ص۱۴۷

۱۱۔ ایضاً، ص۱۷۲

۱۲۔ حسن منظر، ''العاصفہ''، کراچی: شہرزاد پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص۹۹

۱۳۔ ایضاً، ص۱۳۹

۱۴۔ ایضاً، ص۱۴۰

۱۵۔ ایضاً، ص۱۵۹، ۱۶۰